بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

آگے بڑھنے کے بجائے بات کی ڈور کا سرا ایک بار پھر پیچھے جا کر پکڑنا ہوگا۔

انتخابی کامیابیوں، ناکامیوں اور فوائد و نقصانات سے قطع نظر، ہمارا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ یہاں سیکولرازم نے خاصی پیش قدمی کر لی ہے۔ مسجدوں میں نمازیں بھی جاری ہیں، مدرسوں میں تفسیر و حدیث کے درس بھی ہو رہے ہیں، جلسوں میں وعظ اور تقریریں بھی جاری ہیں۔ کتابیں، رسالے اور پمفلٹ بھی چھپ رہے ہیں، جلوس اور مظاہرے بھی ہوتے ہی رہتے ہیں، خالص تبلیغ کے ذریعے اسلام لانے والے گروہ بھی کام کر رہے ہیں۔ مشائخ کے اوراد و ادعیات بھی جاری ہیں ــــ مگر سیاسی میدان میں، اقتدار کے میدان میں، ذرائع ابلاغ کے میدان میں، ادب اور فنونِ لطیفہ اور بے حجابی نسواں اور مخلوط ثقافتی تقریبات کے دائروں میں لادینیت (سیکولرازم) کی جو پیش قدمی ہو رہی تھی وہ حالیہ انتخابات کے بعد کچھ کر اس طرح سامنے آئی ہے کہ یوں لگتا ہے جیسے اس نے یک لخت ایک لمبی جست بھری ہو۔ مگر بات یہاں ختم نہیں ہو رہی، یہ نئے دورِ لادینیت کا آغاز ہے اور یہ آغاز نت نئے انڈے بچے دیتا رہے گا۔

سب سے پہلی چیز تو ہمارے نوٹس میں یہ آتی ہے کہ ہمارے ہاں جو آزادانہ اور منصفانہ انتخاب سنہ ۱۹۸۵ء میں منعقد ہو کر ایک نئے دورِ جمہوریت کا سبب بنے ہیں وہ کاملاً لادینی نوعیت کے انتخابات ہیں۔ ان میں ہر قسم کے لوگ ــــ حتیٰ کہ مخالفینِ پاکستان بھی ــــ ووٹر تھے۔ ان میں ایسے ایسے لوگ امیدوار

بنے اور کامیاب بھی ہو گئے، جن کی زندگیوں کے تاریک پہلو رسوائے زمانہ ہیں اور جن کی کسی علامت دین یا دینی علم و فکر کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہے۔ اسی طرح وزارتوں پر جانے والے حضرات کے اسلامی کردار کے بارے میں کسی نے نہیں پوچھا۔ یہ بات محض دینی جذبے ہی سے نہیں کہی جا رہی بلکہ موجودہ دستور میں جو علماء کے متفقہ ۲۲ دستوری اصولوں کے مطابق نہیں ہے اور جس کی دفعات کے ساتھ اسلامی نظریاتی کونسل کا اتفاق بھی پوری طرح سے نہیں ہے، اس میں بھی اتنی اسلامی دفعات اور شقیں انتخابات اور امیدواروں اور کامیاب نمائندوں کے متعلق موجود ہیں کہ آج اگر کوئی عدالت ان کو سامنے رکھ کر حالیہ انتخابات کا جائزہ لے تو معلوم نہیں کیا نتیجہ نکلے۔ میرے محترم دوست محمد صلاح الدین صاحب نے ایسی تمام دستوری دفعات اور شقوں کو تکبیر (یکم دسمبر ۸۵ء۔ ص ۹ تا ۱۳ و بقیہ بر صفحہ ۲۲) میں شائع کر دیا ہے۔ بلکہ شاید ان کی طرف سے جناب خالد اسحٰق صاحب نے عدالت عالیہ میں رٹ بھی دائر کر دی ہے۔ اب یہ جائزہ لینا تو عدالت کا کام ہو گا کہ جناب صدر مملکت، جسٹس نصرت صاحب، وزارت و محکمۂ قانون اور ملک کے دانشوروں، ذرائع ابلاغ کے ارباب اور سیاسی لیڈروں نے دستور کے مندرجات و مشمولات سے اتنا تغافل کیوں برتا۔ نجانے اب چارۂ کار کیا ہو گا؟

سیکولر انتخابات کے نتیجے میں بالکل سیکولر حکومت (اور اس کی اسمبلیاں) وجود میں آئی۔ جہاں اب تک نہ کسی مسئلے کے متعلق یہ سوال اٹھا کہ اس کے بارے میں اسلام کی رہنمائی کیا ہے اور نہ کسی معاملے میں اسلام کی رہنمائی کی طرف توجہ دلائے جانے پر کارروائی کا رخ تبدیل ہوا۔

یہاں میں آپ کو ایک جھلک دکھاتا ہوں۔

۲۷ دسمبر کے اخبارات کے بموجب محمود الرشید صاحب نے تحریک پیش کی کہ بھٹو جو عدالتی نظام سے سزا یافتہ ہیں ان کے لیے شہید کا لفظ استعمال کرنا عدلیہ کی توہین ہے۔

آگے چلنے سے پہلے ذرا سا ایک جملۂ معترضہ ـــــ کہ عدلیہ کو اس قسم کے معاملات میں توہین سے بچانے کا احسن طریقہ یہ ہے کہ قانون میں تبدیلی کر کے آئندہ کے لیے عدالتوں کو یہ طریقہ بتایا جائے کہ وہ جس کو بھی سزائے موت سنائیں، اس کے لیے فیصلے میں یہ لکھیں کہ ہم اس شخص کو شہادت کی موت کی سزا دے رہے ہیں۔

ہاں تو محمود الرشید صاحب کی تحریک پر دستور، قانون، ضابطہ کارروائی یا کم سے کم ضابطہ اخلاق

ہی کے تحت کوئی اعتراض اٹھانے کے بجائے داڑھیوں کے متعلق پیپلز پارٹی کے ایک رکن حزبِ اختلاف نے نہایت درجہ رکیک انداز میں اظہارِ نفرت کیا، پھر صوبائی وزیر افضل اعزاز کھڑے ہوئے تو اُن کو بدترین انداز میں گالی دی ـــــ انسانیت کے آخری نشان سے بھی یہ نمائندگانِ عوام نیچے اتر گئے۔ یعنی توہینِ انسانیت بھی، توہینِ شریعت بھی اور توہینِ جمہوریت بھی۔ بعدازاں ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔ اور بات کی صفائی کرنے کے بجائے محض کارروائی حذف کردی گئی۔ سوال یہ ہے کہ شریعت کے شعار اور پیروئ سنتِ رسولؐ کی ایک علامت کی توہین کی تلافی اتنی سی بات سے کیسے ہوسکتی ہے کہ کارروائی حذف کردی گئی۔ خدا کے کاغذات میں لوگوں کے اقوال اور اعمال کون حذف کرا سکتا ہے؟

اسی طرح مولانا منظور چنیوٹی نے (اخبارات ۲۹ دسمبر ۸۸ء) ضیاء کے لیے دعائے مغفرت کی تحریک کی تو پھر ایک ہنگامہ برپا ہوا۔ تحریک نامنظور ہوگئی۔

اِن مثالوں سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ لادینیت کس زور شور سے چڑھی آرہی ہے۔ نہ قواعد کا لحاظ، نہ انسانیت کا خیال، نہ دین داری کی حِس ـــــ بس جہاں کوئی مذہبی بات آئے، آج کل کے جنگی (MILLITANT) لادینیت پسندوں پر مرگی کا دورہ پڑ جاتا ہے۔

رانا شوکت محمود (پی پی پی) نے بعد میں پنجاب اسمبلی کے ارکان کی ایک دعوت کی تو اس میں فرمایا کہ ملاازم کی پیداوار ارکانِ اسمبلی ماحول خراب کر دیتے ہیں۔ یہ "ملاازم" کی اصطلاح جسے مغربی امپیریلسٹوں نے جابجا مزاحمت کرنے والی دینی قوتوں کے خلاف گالی کے طور پر استعمال کیا تھا۔ اب اُن کے ذہنی غلام اس اصطلاح کو اس مقصد سے استعمال کرتے ہیں کہ یا تو اسلام ان کا "ملاازم" بن کر رہے، ورنہ پھر یہ اسے ملاازم کہہ کر ہمیشہ کے لیے غضب ونفرت کا نشانہ بنائیں گے۔ اس طرح اصطلاحوں کو گالی بنا کر استعمال کرنا بھی آتا ہے۔ ورنہ دوسرے لوگ بھی فرنگا ازم، مسٹنڈا ازم، لفنگا ازم، لفاٹیا ازم جیسی اصطلاحیں کو ایجاد کرکے عام کرسکتے ہیں۔ کیا انہیں یہ پسند ہے؟[1]

۱؎ توہینِ شریعت کے ان اذیت ناک واقعات پر بھی دینی حلقوں نے کوئی مؤثر ردعمل نہیں دکھایا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہر طرف ہُو کا عالم ہے۔ ع اندر سے سناٹا آواز نہیں آتی

۔ ضرورت کو معلوم ہونا چاہیے کہ اسلام کی پابند زندگی سے ڈر کر جس سیکولرازم کو [illegible]
بنا رہے ہیں اس سے وہ بہرحال کہیں نہیں جا سکتے۔ وہ دن دور نہیں جب خود ان لوگوں کے [illegible]
آپ دیکھیں گے کہ سیکولرازم سے نجات نہیں۔ وہ سیکولرازم جس نے [illegible] انقلاب برپا کیا
جس نے افغانستان میں ایک سپر پاور کو ناکوں چنے چبوا دیے۔ پاکستان میں [illegible] ماحول کی وجہ سے
ناموافق حادثات ہو سکتے ہیں۔ لیکن جب بھی کسی مخالف قوت کی چڑھائی ہوتی [illegible] ہے تو پھر
سے اسلامی رجحانات اس طرح نمودار ہو جاتے ہیں جس طرح طوفانی موجوں کے تھمتے ہی روشنی کا مینار سارے
کا سارا سربلند دکھائی دینے لگتا ہے۔ [illegible] آپ سیکولرازم کو جتنے زیادہ چرکے دیں گے وہ اتنا ہی زیادہ
[illegible] ۔ پھر آپ بے بس ہو جائیں گے۔ اگر قرآن و حدیث زندہ ہیں اور ہماری تاریخ باقی
ہے تو سمجھیے کہ تجدید و احیائے اسلام کے جذبے بھی ابھرتے رہیں گے ——— تا آنکہ تبدیلی مکمل طور پر
واقع ہو جائے۔

جو لوگ گالیوں پر اتر آتے ہوں وہ تو دلیل و اخلاق کے لحاظ سے اپنی کمزوری کا خود اعلان کر رہے ہوتے ہیں۔

لادینیت کی بہت بڑی پیش قدمی کسی عورت کی حاکمانہ سربراہی کا واقعہ ہے جو موجودہ عالمِ اسلام میں پہلی مرتبہ نمودار ہوا ہے۔ اور مغرب کی لادین تہذیب کے تسلط کے لیے سامراجی اور مخالفِ اسلام قوتیں جس چیز کو اسلامی دین و معاشرت کی چٹانوں میں شگاف پیدا کرنے کے لیے بہترین سمجھتی ہیں وہ عورت ہے۔ عورت کو پہلے دورِ نو گھر سے نکالتا ہے، پھر پردے سے باہر لاتا ہے، پھر زندگی کی تمام سرگرمیوں میں مردوں کے دوش بدوش لا کر مخلوط معاشرت پیدا کرتا ہے۔ اتنا کچھ کام ہو جاتے تو سمجھیے کہ لادینیت، مغربیت اور ضمناً عیسائیت کے لیے بھی بہت خوشگوار ماحول تیار ہو گیا۔ اگلا قدم عورت کو سیاسیات میں لانا ہوتا ہے، جس کی آخری حد یہ ہے کہ عورت صدارت و وزارت جیسے عہدوں تک پہنچ جائے۔ اب گویا سیکولرازم نے اپنا کھونٹا گاڑ دیا۔ (جیسے کہ حال ہی میں نعوذ باللہ ایک جرمن اخبار نے پاکستان کے سیاسی تغیر پر یہ سرخی لگائی کہ "خدا ایک عورت سے ہار گیا" (نعوذ باللہ)

اِس جملے سے مغرب کی ذہنیت اور عورت کے مسئلے کا دین اور لادینیت کے لیے علامت ہونا آپ کے سامنے واضح ہو جاتا ہے۔

اتنا بڑا واقعہ ہو گیا، پیپلز پارٹی کی فتح سے بھی بڑا!

مگر اس واقعہ کا ایک تو سب کو پہلے سے اندازہ تھا اور دوسرے اس کے ہو جانے پر لوگوں کی کثیر تعداد تعجب کا شکار ہو گئی - شروع شروع میں عام لوگ تو کیا، دینی حلقے بھی خاموش رہے۔ بس اِکّا دُکّا آواز بلند ہوئی کہ یہ صورت خلافِ اسلام ہے۔

اُلٹا دوسری جانب سے یہ فاتحانہ آواز بلند ہوئی ہے کہ یہ واقعہ عالمِ اسلام کے اندھیروں سے نکلنے اور اُجالوں کی طرف عازمِ سفر ہونے کی نوید بنا ہے کہ پاکستانی قوم نے تاریخِ اسلام میں پہلی بار ایک خاتون کو وزیر اعظم منتخب کر کے اُجالوں کی جانب قدم بڑھایا ہے - (ایک اخباری بیان)

پھر دوسری طرف بھی کچھ جھر جھری سی لی گئی - ایک نام مولانا سمیع الحق صاحب کا مجھے یاد ہے — دو ایک اور آوازیں بھی ہوں گی، مگر سرسری - بعد میں دینی رسائل میں نوٹ لکھے گئے -

بعد میں عبدالعزیز بن باز اور چند علماء کے انفرادی فتووں کے علاوہ ایک مشترکہ بیان ۱۵ اصحاب کی طرف سے جاری ہوا - اس پورے عرصے میں سب سے زیادہ زوردار تحریر "عورت کی سربراہی کا مسئلہ" آئی - اس وقت تک چہ میگوئیاں شروع ہو چکی تھیں، لیکن باقاعدہ سوچی سمجھی معتدل رائے جماعتِ اسلامی کی مجلسِ شوریٰ منعقدہ ۱۸ تا ۲۰ دسمبر ۸۸ء کی قرارداد "سیاسی صورتِ حال" میں سامنے آئی - الفاظ یہ ہیں:

"اضطراب کے اسباب کی فہرست میں ایک اور اضافہ خاتون کی سربراہی کا مسئلہ ہے جو مسلمہ شرعی اُصول کی کھلی خلاف ورزی ہے اور جس نے ملک اور عالمِ اسلام میں بے چینی پیدا کر دی ہے۔"

ستم یہ ہوا کہ عورت کی حاکمانہ سربراہی کا مسئلہ جس پر صحابہؓ، تابعین اور تبع تابعین، اور ہر دور کے علماء کا اجماع چلا آ رہا ہے، اس کے متعلق جب بات چھڑی تو کوئی خطیب اور کوئی امام ایسے بھی تھے، جنھوں نے عورت کی حکمرانی کے جواز کے راستے نکالے - کچھ بین بین قسم کے حضرات تھے جنھوں نے یہ تو مانا کہ اسلام کی رُو سے یہ درست نہیں - لیکن جب معاشرے میں ہم دوسری خرابیوں کو قبول کرنے میں

تو یہ ایک اور سہی![1]

دراصل یہ واقعہ بھی سیکولر جمہوریت کا نتیجہ تھا - دینی لوگ جنہوں نے "جمہوریت بہ جمہوریت" کی پکار تو زور و شور سے جاری رکھی لیکن اس کے اسلامی تصور سے ذہنوں کو بیگانہ ہو جانے دیا، یا دوسرے لفظوں میں جتنا دعوتی چرچا جمہوریت کے لیے ہوا اتنا اسلامیت کے لیے نہ ہوا ......

پھر اگر لادین جمہوریت نمودار ہوتی ہے تو اس کے بطن سے تو احوال کی وہی نسل چلے گی جیسے یورپ اور امریکہ میں دیکھی جاتی ہے -

اس مسئلے پر ایسا نہ ہو سکا کہ فوری طور پر علماء کے مشترکہ اجلاس ہوتے، متفقہ فیصلہ کیا جاتا اور عوام کو رہنمائی دی جاتی - کوئی دستاویز تیار نہ ہو سکی، کوئی سیمینار اہلِ علم و فضل کا منعقد نہ ہو سکا کسی اخباری فورم کا انتظام نہ ہو سکا، کوئی پمفلٹ نہیں اور.... بھی کچھ نہیں - بس " یک حرفِ کاشکے کہ بہ ہر جا نوشتہ ایم "

---

[1] کچھ حضرات جو ایک واقعہ کو دوسرے کے لیے نظیر بناتے وقت یہ نہیں سوچتے کہ دونوں واقعات میں عدم مماثلت کے کتنے وجوہ ہیں - وہ مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح کے صدارتی انتخابات میں آنے کو آج کی صورتِ واقعہ کے لیے دلیلِ جواز بناتے ہیں - حالانکہ ان کا معاملہ یہ تھا کہ وہ اصطلاحاً سنِ یاس کو پہنچ چکی تھیں اور "مادرِ ملت" قرار پا چکی تھیں - ان کو لوگوں نے اضطراراً اٹھایا کہ ایوبی آمریت کو توڑنے کے لیے کوئی دوسری مناسب شخصیت موجود نہیں، اور تیسرے یہ کہ انہوں نے یہ فیصلہ کر کے قدم اٹھایا کہ میں حکومت نہیں کرنا چاہتی، صرف ضروری دستوری ترامیم اور بعد ازاں نئے انتخابات کرا کے واپس آ جاؤں گی - اس کے لیے انہوں نے تین ماہ کی مدت تجویز کی تھی جس میں تھوڑا بہت اضافہ ممکن تھا - اس کا ریکارڈ بھی موجود ہے اور براہ راست تعلق رکھنے والے گواہ بھی! اس کے باوجود بھی بہت زور سے اعتراضات کیے گئے - ان میں جو مولانا مودودیؒ کے سامنے آئے، انہوں نے ان کے تفصیلی جواب دیئے اور خاص طور پر یہ بات کہی کہ اس اضطراری اور مخصوص الاحوال صورت کو عورت کی حکمرانی کے لیے اصولاً دلیل نہیں بنایا جا سکتا - کہاں مادرِ ملت فاطمہ جناح اور کہاں محترمہ بے نظیر -

اس معاملے میں علماء کو مشترکہ طور پر صاف اعلامیہ جاری کرنا چاہیے تھا کہ ایسی غیر شرعی صورت کو ہم ویسا ہی ناقابلِ قبول سمجھتے ہیں، جیسا آمریت یا دوسرے ممنوعاتِ دینیہ کو۔ مگر جبر و قوت پر قائم ایک واقعہ کو فوری طور پر اگر ہم بدل نہیں بھی سکتے تو ہم رائے عامہ کو اس کے خلاف تیار کر کے نئے حالات ضرور پیدا کریں گے۔

ذرا خیال فرمایئے کہ پچھلے کئی برسوں میں کوئی یہاں جرأت کر سکتا تھا کہ عورت کے حقِ حکمرانی کی آواز اٹھائے۔ اسلام کے حق میں کمزور سی اتنی فضا ضرور تھی کہ یہاں صریحاً مخالفِ اسلام فیصلے اور اقدامات کرنا ممکن نہ تھا۔ اِس فضا کو برقرار رکھنے کے لیے علمائے پاکستان اور جماعتِ اسلامی کی بڑی مساعی تھیں۔ افسوس کہ وہ فضا مزید مضبوط ہونے کے بجائے اُلٹا اور کمزور ہوگئی۔ اسی کمزوری کا نتیجہ یہ ہوا کہ دینی جماعتوں نے کسی معاملے میں اسلامی اُصول و اقدار پر زیادہ زور دیا ہی نہیں، بلکہ جمہوریت اور اتحادوں اور سیٹوں وغیرہ کے معاملات تک ساری مساعی محدود رہیں۔

بلکہ حد سے بڑھی ہوئی دیدہ دلیری یہ ہے کہ نفیس صدیقی صاحب نے اپنے مضمون میں محترمہ بے نظیر کو "حقیقی زندگی کا دیو مالائی کردار" قرار دیا۔ (نوائے وقت ۵ جنوری ۱۹۸۹ء ص ۵۔ک ۷،۸) اس طرح کی قصیدہ خوانی ہمارے پورے دورِ تاریخ میں نہیں ملتی۔ یہ الفاظ ہی دوسرے دائرے سے متعلق ہیں، اسلام سے کوئی واسطہ نہیں۔ صنمیات اور دیومالائی کردار صرف بُت پرست قوموں کے ہاں پائے جاتے ہیں جو خیالی ہوتے ہیں اور ان سے بسا اوقات نہایت واہیات کہانیاں وابستہ ہوتی ہیں اور وہ انسانیت سے کچھ ماورائیت کی شان رکھتے ہیں۔ یہ فقرہ تو بھارت کی مذہبی طرزِ فکر کے آگے ہمارے افکار کے سرِ ورس کو خم کر دیتا ہے۔

اور اس موقع پر ماہرِ تعمیرات نیر علی دادا (بہ روایت قدسیہ بیگم) کا یہ حقیقت نما جملہ یاد آتا ہے کہ "یہ ایسی قوم ہے جو اپنے پر فخر کرنے کے بجائے خود کو مسترد کرتی ہے۔" (نوائے وقت۔ اشاعت جمعہ ۱۳ جنوری صفحہ ۲۲)

اس عالم میں جب اپنی کمزوری کی وجہ سے لوگ محسوس کرتے کہ ان کی غیرتِ دینی اور حمیتِ ملی کے جذبوں پر منوں وزنی چٹانیں رکھی جا رہی ہیں تو ان کے دل یہ چاہتے کہ "مردے از غیب بروں آید و کارے بکند"

جناب پیر محمد ابراہیم ایک دن اٹھے اور اپنی فریاد لے کر کورٹ میں جا پہنچے اور اس مضمون کی رِٹ دائر کر دی کہ مسماۃ بے نظیر بھٹو ... عدالتوں سے سزا یافتہ باپ کو شہید قرار دے کر اور قومی ذرائع ابلاغ سے قاتل کو شہید کہلوانے کے جذبے میں پڑ کر توہینِ عدالت کی مجرم ہیں۔ لہٰذا ان کو عدالت عہدۂ وزارتِ عظمیٰ پہ رہنے سے روک دے بلکہ وہ پارلیمنٹ کی رکنیت کی بھی اہل نہیں رہی ہیں۔ (روزنامہ جسارت ۱ر جنوری ۱۹۸۹ء)۔ اس تلخیص میں نہ تو پوری بات آسکی اور نہ لفظاً بہ لفظاً خلاصۂ مدعا ہے۔ آج اس مضمون کو ختم کرنے کے بعد اخبار سے اطلاع ملی کہ یہ رٹ خارج کر دی گئی۔ (بحوالہ نوائے وقت و جنگ ۱۶ر جنوری)۔ اہلِ علم و اہلِ دین کو آب و ہوا تو معلوم ہونی چاہیے۔

اب سرمایۂ تسکین ایک اور رِٹ ہے جو زیرِ تیاری ہے۔ شنیدہ طور پر اس کا مضمون سیدھا سا یہ ہے کہ عورت از روئے اسلام کسی اسلامی مملکت کی سربراہ نہیں ہو سکتی۔ اسے متعدد علما ریل کر داخل کریں گے جس کی سربراہی شاید مفتی محمد حسین نعیمی کریں گے۔ خدا کرے یہ کوشش مؤثر ثابت ہو۔

مگر راقم کا ذاتی احساس یہ ہے کہ پچھلے دس پندرہ سال کی کوتاہیٔ کار کے متعلق پوری ملت، اس کے علما اور اس کے اداروں کے خلاف جو رِٹ تاریخ کی خدائی عدالت میں دائر ہے، سارے معاملے کا انحصار اس کے فیصلے پر ہے۔

اب آپ ذرا یہ دیکھیے کہ لادینیت کے شجرِ خبیثہ پر جب بہار آئی اور اسے دوٹوں کا پانی ملا تو ہر شاخ سے نئی کونپلیں اور شگوفے پھوٹنے لگے ہیں۔

محترمہ نصرت بھٹو فرماتی ہیں کہ ہماری جدوجہد استحصال، رنگ، نسل اور عقیدے کی تعریف سے پاک معاشرے کی تعمیر ہے۔ (جنگ ۴ر جنوری ۸۹ء ص ۱- کالم ۷، ۸)۔ چلیے عقیدے سے بھی چھٹی ہوئی — جیسا منحوس استحصال، ناپسندیدہ عقیدہ — عقیدہ اگر زندگی کے بڑے بڑے معاملات میں دخل نہ دے اور خدا و رسولؐ کا دین اگر سیاست و معیشت سے تعرض نہ کرے تو ایسے نیم جان بے ہوش عقیدے کا ہونا نہ ہونا برابر۔

یہ ہیں منتہا ان لوگوں کے!

دلچسپ یہ کہ اسی نظریے کی ایک دوسری تعبیر بھی ہے۔ ۱۲ر جنوری کی شب ٹیلی وژن پر فیض احمد فیض